ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی منتخب نظمیں ــــ ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر صدف بخاری

Abstract:

This paper explores stylistic peculiarities of Tabassum Kashmiri's poetry in the perspective of 'Linguistic Formation' a literary movement of the 1960's Kashmir himself remained ardently associated with. Although his later poems are quite reminiscent of a macabre and unquestionably an aesthetic imagery, quite discernible in his later poems is a bifurcation into two categories __ violence and a stoic resistance imbued in divine fold, an imagery which is tour de force of Tabassum Kashmir's poetry. On the whole, his poems genuinely hold a mirror to contemporary poetic trends and shifting paradigms of fear and angst, which have actually impelled the researcher to take up the arduous task of analyzing his poetry.

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ نظمیں ساٹھ کی دہائی میں متعارف ہونے والے ایک نئے شعری اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں تاہم ان نظموں کا مجموعی تاثر اس دور کی لسانی تشکیلات کے تحت سامنے آنے والی شاعری سے قدرے مختلف بھی ہے۔

زیرِنظر شعری مجموعے ''تمثال اور دوسری نظمیں'' کا زمانۂ تخلیق (۱۹۸۱-۱۹۶۱ء) ہے اور یہ زمانہ ہماری قومی زندگی میں طویل دور کی آمرانہ حکومتوں کے زیرِاثر رہا یہی وجہ ہے کہ ایک گھٹن اور پژمردگی کا احساس ان تخلیقات میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ دور ترقی پسند تحریک کی بازگشت کی تاثیر بھی رکھتا ہے اور حلقہ اربابِ ذوق کے ثمرات بھی سمیٹ رہا ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق کے نمائندہ فن پاروں میں موضوعات کی نسبت اسلوب اور ہیئت پر زیادہ توجہ دی جا رہی تھی اس لیے زیرِ مطالعہ نظموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بھی قابلِ توجہ ہے یہ وہ دور ہے جب نوجواں

شعرا کی ایک مختصر سی جماعت شعر و ادب کے مرکزی دھاروں سے کسی حد تک منفرد نظر آنے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے شعری اظہار کے لیے شہری زندگی کا روزمرّہ اور ڈکشن بروئے کار لاتی ہے۔

افتخار جالب کا نام اور کلام اس حوالے سے ایک اہم دستاویز ہے کہ اُنہوں نے اپنے اظہار میں نئے اسلوب سخن کی نمائندگی کی بلاشبہ ان کی حیثیت ایک سرخیل کی سی ہے جنھوں نے لکھنے والوں کی ایک معقول تعداد کو متاثر کیا البتہ سوچے سمجھے انداز کی شعوری کوششیں اس اندازِ سخن کو اپنانے والوں کے لیے سودمند ثابت نہ ہوئیں اور محض ایک نیا لفظ برتنے کے شوق میں شعریت کا عنصر زائل ہونے لگا۔

یہ بات بہرحال قابلِ ذکر ہے کہ لسانی تشکیلات کی اس ادبی تحریک نے جدید شعری ڈکشن میں کچھ اہم ضافے بھی کیے اور اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے اچھی مثالیں بھی چھوڑیں ___ شہری زندگی کی مصنوعی فضا اور چکاچوند کو شعری اظہار میں سمونے کے لیے نیا ڈکشن متعارف کروایا گیا اور پہلی دفعہ برملا اُن الفاظ کو برتا گیا جو صرف عام کاروباری گفتگو یا روزمرّہ تک محدود تھے یوں شاعرانہ اظہار میں شہری زندگی کی بول چال کے بہت سے الفاظ بھی سامنے آئے جو جدید اشیائے صرف کے نام تھے یا اُن ایجادات کے نام بھی تھے جن کا کوئی نعم البدل اُردو زبان میں موجود نہیں تھا لکھنے والوں کی اس جماعت کی یہ لسانی بغاوت یقیناً ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا باعث بنی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی نوجوانوں کی اِسی جماعت کے ایک رُکن رہے ہیں جنھوں نے نئے شعری اظہار کو نئے اسلوب سے آشنا کیا۔تبسم کاشمیری کی نظموں کا بنیادی مسئلہ نئی لفظیات ہی کو رائج کرنے کا مسئلہ نہیں بلکہ نئی شعری صورتِ حال کو جدید شعری منظر نامے کے حوالے سے دیکھنا ہے۔

سیاسی و سماجی حالات کی روایتی جانچ پرکھ میں پڑے بغیر اگر مختصراً بیان کیا جائے تو یہ دَور ہمارے ادب میں آزادیِ اظہار کا دَور نہیں تھا جن لوگوں نے ایک وطن بنتے دیکھا اور کسی حد تک عملاً بھی اس کی تشکیل میں شریک کار رہے اُنھوں نے ایک غیر مستحکم ریاست میں مجبوری کی زندگی گزارنے کے خواب نہیں دیکھے تھے لیکن خواب پر لمحۂ معروض کو سبقت ہوئی۔

ایک بڑے مرکز سے ٹوٹنے کے بعد اور پھر کسی نئے دھارے میں شامل نہ ہوسکنے کا خوف اب ہزیمت اور درماندگی میں بدلنے لگا اور ہر آن زندہ رہنے پر مُصر زندگی اپنے تمام خارجی و باطنی تقاضوں سمیت آگے بڑھتی رہی۔ خارج کا تو بھلا ہو کہ اسے نئے زمانے سے پسماندگی کی جگہ ''ترقی'' اور جمود کی جگہ ''تبدیلی'' کے تحفے ملے لیکن ان کی قیمت باطنی دنیا سے وصول کی گئی۔ ہجرتیں، جلاوطنیاں، نقل مکانیاں، اجنبیت اور خوف اس دُنیا کا تعارف بن گئے۔تبسم کاشمیری کی نظم اِسی پس منظر کی زائیدہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری حافظے کی سوتیلی بیٹی ہے! اس لیے اچھی شاعری سے ہرگز یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ گزرے ہوئے واقعات یا درپیش صورتِ حال کو بعینہٖ اپنے اظہار کا موضوع بنائے بلکہ اس کے لیے ایسی ہنرمندی درکار ہے جو اسے اطلاع یا رپورتاژ کے پیرائے سے الگ کردے اسی لیے خالص شاعرانہ ہنرمندی تلخیِ دوراں کے بیان میں بھی اس کے تخلیقی حُسن کو مجروح نہیں کرتی لطافتِ بیان کو صیقل کرنے کے لیے اس حوالے سے شاعر جن

وسیلوں سے کام لیتا ہے امیجری ان میں سے نہایت اہم وسیلہ ہے۔تبسم کاشمیری بھی اپنے شعری اظہار کے لیے اپنے سب سے اہم ہنر امیجری سے بھرپور کام لیتے ہیں۔

تبسم کاشمیری کے ہاں الفاظ متحرک و مستعد بھی ہیں اور تھکے ماندے، روتے بسورتے بھی، روپہلی منزّہ روشنی کے استعارے بھی اور ہمارے دل و دماغ میں چھپے الم خانوں کے چراغ بھی۔

موضوعاتی اعتبار سے ان نظموں کی فضا ایک مکمل شہر آشوب کی سعی ہے جس میں ہر آن ظلم سہتی مخلوق انفرادی اور اجتماعی سطح پر جینے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف ہے قدم قدم پر عفریتوں کی گھاتیں ہیں اور انسان اپنے انسان ہونے کے وصف سے محروم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ انسان ظلم سہنے والا بھی ہے اور ظلم کرنے والا بھی۔

تبسم کاشمیری کی نظم کا ایک رنگ انفعالی بھی ہے لیکن یہ تخیلاتی سطح کی رومانوی انفعالیت نہیں بلکہ اپنے ماحول سے برسرِ پیکار ایک ایسے شخص کو سامنے لاتی ہے جو اپنے گرد و پیش پھیلی وسعتوں میں تنہا رہ گیا ہے یہ نئے زمانے کا وہ نیا انسان ہے جو اپنے عہد سے کوئی ربطِ پیہم استوار کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یقیناً ہر عہد کے نئے لوگوں کو بدلتی ہوئی اقدار میں اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ایسے ہی جتن کرنے پڑتے ہوں گے لیکن اس عہد کی خاصیت یہ ہے کہ واقعی یہ عہد برق رفتاری، بربریت، آمریت، عالمگیریت اور اس سارے ہجوم سے باہر نکل کر آنے کی کوشش کرتی ہوئی فرد کی انفرادیت کا عہد ہے۔

اس حوالے سے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''.... ہندو پاک کے بڑے شہروں اور مغرب کے شہروں کی تمدنی اور ذہنی فضا میں مماثلت کا رنگ رفتہ رفتہ گہرا ہوتا جارہا ہے سائنس اور سماجی علوم (خصوصاً عمرانیات) کی ترقی نے یہ احساس عام کردیا ہے کہ اس لامحدود نظامِ شمسی میں کرہ ارض کی حیثیت ایک چھوٹے سے گھر اور اس پر بسنے والوں کی حیثیت ایک مختصر سے خاندان سے زیادہ نہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ افکار و اقدار نیز عقائد و نظریات کی کثرت اور ان کی باہمی پیکار کا احساس بھی تاریخ کے کسی دور میں آج کی بہ نسبت شدید تر نہیں رہا انسانوں کے خوف اور اندیشے مشترک ہیں لیکن جذباتی لاتعلقی اور ایک سرد مہر معروضیت نے ہر احساسِ قرب کو پسپا کردیا ہے۔ اجتماعی مصائب و مسائل کے باوجود زندگی ایک انفرادی مسئلہ بن گئی ہے'' ۔[۲]

Post colonial اثرات اس سارے عہد پر ایک سیاہ رات کی طرح چھائے ہوئے جس سے انسان کی سائیکی بڑے منفی انداز میں متاثر ہورہی ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود تبسم کاشمیری کی نظم کا دوسرا مزاج وہ ہے جس میں شاعر اپنی افسردگی اور ملال کو اپنے اُداس منفعل اور کسی حد تک درشت لہجے سے الگ کرکے پیش کرتا ہے جو اِس ماحول میں رومانوی سطح پر زندہ رہنے کی بڑی قابلِ قدر کوشش ہے۔ اس نوعیت کی نظمیں گو کہ تعداد میں کم ہیں لیکن ہوا کے جھونکے کی طرح ایک خوشگوار احساس رکھتی ہیں کچھ نظمیں ان میں شاعر کے قیامِ جاپان کی یاد دلاتی ہیں اور ان کا لینڈ سکیپ ہی چڑھتے سورج کی سرزمین ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اوّل الذکر نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کا آغاز دعائیہ انداز کی نظموں سے ہوتا ہے جن میں ''ایک دعا'' اور ''شہروں کے لیے ایک نظم'' بڑی قابلِ توجہ نظمیں ہیں۔

پہلی نظم کسی حد تک روایتی طرزِ سخن بھی رکھتی ہے اور مجموعے کی اوّلین نظم ہونے کی حیثیت سے قدرے مثالی انداز کی حامل ہے جس میں تمام مفلوک الحال شاعر کی محبت اور دعا کا انعام پاتے ہیں لیکن دوسری نظم میں جلتے ہوئے شہر ___ صرف دعا کے مستحق نہیں رہتے شاعر خود ان کے ساتھ اپنے آپ کو جلتا ہوا محسوس کرتا ہے یہ حدّت اس محبت کی ہے جو شاعر کو اپنے شہروں اور ان میں بسنے والے لوگوں سے ہے یہی وہ اندازِ سخن ہے جو ترقی پسند تحریک کے اہلِ سخن کے برعکس صورتِ حال پر بلند بانگ تبصرہ نہیں کرتا بلکہ خود اس منظر نامے کا حصّہ بن جاتا ہے۔

ایک بورژوائی فصل جو اہلِ حَکَم یا ''اہلِ دانش'' نے اس مبتلائے غم مخلوق سے ہمیشہ قائم رکھا وہ یہاں مٹنے لگتا ہے۔

شاعر نے کئی حسیاتی امیجز کے ذریعے اپنے شہروں سے ایک تعلق خاطر کا احساس دلایا ہے ان شہریوں کے گرم بالوں، زرد گالوں اور سوکھتے ہوئے پامال جسموں پر اپنی وفا کے ہونٹ ثبت کیے ہیں، ان کی دہلیزوں کو سجدہ گاہ کی طرح محترم جانا ہے۔

اس نظم میں بہت خوبصورت صوّری امیج اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر اپنے شہروں کی فصیلوں کے زخم خوردہ انتظاریہ لمحوں کو پینٹ کرتا ہے۔

مجھے ان زخم خوردہ، مہرباں، بوڑھی فصیلوں سے محبت ہے
جو اپنی بوڑھی آنکھوں سے
نئے دن کے نئے سورج کا چہرہ دیکھ کر خاموش رہتی ہیں
اور اپنی تار آنکھوں سے ہزار آنسو گراتی ہیں

حتیٰ کہ شہر کی زرد تاریک گلیاں، ان کے مکاں، مکیں کھڑکیاں آنگن ممٹیاں اور شہ نشیں شاعر کو ایک انجانی کشش سے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر خود ان کے ساتھ کہیں موجود ہے وہ ظلم و ستم سہتے ہوئے اور خاک وخون میں لتھڑے ہوئے ان کے جسموں اور لہو میں ڈوبی کٹتی ہوئی شہ رگوں پر اپنا دستِ شفا رکھنا چاہتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے گرد و پیش تیزی سے ختم ہوتی ہوئی زندگی کو بچانے کی یہ ایک اضطراری کوشش ہے۔

نظم کی آخری لائنیں اس ساری تڑپ کا حاصل ہیں جب شاعر یہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ ان شہروں میں بسے لوگوں کا نوحہ کسی اُونچی مسند پر بیٹھ کر پیش نہیں کر رہا بلکہ وہ تو خود ان سب میں سے ایک ہے جو اس بربریت کا شکار ہیں۔

مجھے اس شہر کے چہرے پہ اُگتی زرد کائی سے محبت ہے
کہ میں خود کائی ہوں، کہ میں خود تار آنگن ہوں
کہ میں خود زرد چہرہ ہوں

ان لائنوں میں تجسیم یا Personification ایک خاص رنگ سے نمایاں ہوتی ہے اور اظہار کا استعاراتی حسن واضح ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر نظم میں حسِ لامسہ اور باصرہ کو زیادہ بروئے کار لایا گیا ہے۔

''غضب وہ شب تھی'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اپنے عہد کے سیاسی و معاشرتی ابتذال کو موضوع بنایا گیا ہے یہ آمریت اور من مانے طرزِ حکومت کی وہ شب ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی شاعر نے ماضی نمائی (Flash back) کی تکنیک سے اپنے شعری اظہار کا آغاز کیا ہے جس میں اس شب کے ہیبت ناک نزول کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن یہ شبِ دراز ایسی ہے کہ کہیں ختم ہونے میں نہیں آتی۔

نظم کی یہ لائنیں ستم کے اس لامتناہی سلسلے کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

ہوا ہے ہم سے گناہ کیسا
کہ رحمِ مادر سے باہر آ کے جو آنکھ کھولی
زمیں پہ دیکھا شبِ غضب تھی
ہم نے بچپن کی سرحدوں میں قدم جو رکھا شبِ غضب تھی
جب جوانی پہ بھور آئی شب غضب تھی
جب بڑھاپے نے آ کے جھانکا شبِ غضب تھی

یہ غیر مختتم عذاب جو پوری پوری زندگیوں کو نگل گیا ہے کسی صورت بھی ٹلنے میں نہیں آ رہا اور اس کی ہیبت نے پوری فضا کو ایک احساسِ شکستگی میں مبتلا کر رکھا ہے رات دن کا بدلنا اور ماہ و سال کا آنا جانا صورتِ حال کی گھمبیرتا کو تبدیلی کا کوئی اشارہ نہیں دیتا کیا گردشِ وقت کے معانی بدل گئے ہیں یا جبر و استبداد نے مستقلاً عدل و انصاف کی جگہ لے لی ہے۔

نظم ''سانپ بارش'' امیجری کے لحاظ سے بڑی منفرد نظم ہے کسی نامہربان دوست کی طرح اجنبیت و یگانگت کے دونوں رنگ اس میں نمایاں ہوتے ہیں۔

بارش جو تمام مظاہر فطرت خصوصاً نباتات کو ایک نئی تازگی بخشی ہے یہاں بھی اپنی اس خاصیت فیضِ عام میں نظر آتی ہے لیکن شاعر کے گرد و پیش اِس کی کی تاثیر مفقود ہے کہ ایک بدصورتی بدستور ماحول پہ مسلّط ہے بلکہ بارش نے اس بدصورتی کی فضا کو منفی انداز میں متاثر کیا ہے یا یوں کہیے کہ یہ ماحول خود بارش کو بروئے کار نہیں لا سکا۔ بارش جو بجائے خود افزائش اور روئیدگی کا استعارہ ہے یہاں اُن مقامات و مناظر کے لیے عذاب بن کر اُترتی ہے جو اس فضا میں پہلے بھی کسی دلکشی کا باعث نہیں ہیں اور یوں بارش کے ساتھ سانپ کا Paradox سمجھ میں آنے لگتا ہے

''کڑوے تلخ کسیلے ذائقے'' میں چکھنے کی حس بہت نمایاں ہوتی ہے ذائقے کو دراصل اس نظم میں مرکزی حیثیت حاصل ہے جو نظم کے عنوان ہی سے سامنے آتی ہے لیکن نظم اپنے اختتام تک آتے آتے بھرپور سمعی و بصری امیجز تخلیق کرتی ہوئی حسِ شامہ کو بھی مہمیز کرتی ہے جس سے تشدد، بے بسی، ماحول کی زہرناکی اور جلتے ہوئے گوشت

کی تیز بساند کی تمثالیں آپس میں مدغم ہونے لگتی ہیں۔

میرے کان میں سرخ تشدد کی چیخیں
میرے کان میں سرخ تشدد کی چھاونیاں آباد ہوئی ہیں
ہم شوریدہ کڑوے تلخ کسیلے ذائقے
نوزائیدہ شہروں کے منہ پر
قطرہ قطرہ ٹپک رہے ہیں

لفظ ''چھاونیاں'' ملک میں قائم عسکری طرزِ حکومت کا ردّعمل بھی ہے جو اس امیج میں ظلم کی شدت کو ابھارتا ہے۔

''میں وہیل کے پیٹ میں تھا'' ایک ایسی نظم ہے جو مبتلائے سزا صورتِ حال کو سامنے لاتی ہے اس نظم کا موضوع اور ڈکشن نام نہاد ''جدید'' شہری زندگی کا عکاس ہے۔ جہاں ریستورانوں اور نجّی صحبتوں میں زندگی اصل زندگی کی بھونڈی نقالی بن گئی ہے۔

جنسی جذبہ اپنے فطری اظہار سے ہٹ کر تشدد اور وحشیانہ اشتہا کی بے لگامی کا شکار ہے اور پورے ماحول میں کھلے عام ترغیبِ نگاہ کا احساس حاوی نظر آتا ہے۔

نظم کی یہ لائنیں دیکھیے:

میں وہیل کے پیٹ میں تھا
مرے خون میں ریت تھی اور سر کھولتی نفرتوں کا قلعہ
مرے ہاتھ پاؤں اور دھڑ کے ٹکڑے ہوئے تھے
چمکتی ہوئی شاہراہوں کے سینے پہ میں تھا
ریستوران کی کڑوی پیالی میں میں تھا
اور تیز سی گرم چائے میں جلتی ہوئی خشک مخلوق
نچڑے ہوئے زنگ آلودہ چہرے
''اُف مجھے دردِ سر ہے''
تو دوں اسپرین ___ ریڈیو کل یہی کہہ رہا تھا
بھلے چنگے ہو جایئے ___ اسپرین کھایئے
''تم تو خاموش ہو''
تم نہیں جانتے کہ میں آج صاحب کے گھر جاؤں گا ___
اس کی بچی پڑھانے
تم نہیں جانتے اس کی بیگم ___ مری ہڈیاں چاٹتی ہے

اپنی ذات، تشخص اور وقار کے عوض ملنے والی چھوٹی چھوٹی اجرتیں اور شہری زندگی میں ہر دم کسبِ معاش پہ اکساتی

ہوئی ناآسودہ فضا انسان کو ایک مستقل ''دردِ سر'' میں مبتلا کیے ہوئے ہے جہاں کی اشتہاری دنیا ہمیں خود اپنے درماں کے متعلق بھی آزادی سے نہیں سوچنے دیتی اور ریڈیو کے اعلانات اپنی اسپرین پروری جاری رکھے ہوئے ہیں کیا یہ وہی مغربی فضا نہیں جس نے معاشرے کو Consumer Society میں بدل دیا ہے اور اب یہی کاروباری روّیے تیزی سے ہمارے معاشرے کو اپنی زد میں لے رہے ہیں۔ سارتر کا ایک بیان قلم بند کرتے ہوئے اس صورتِ حال کی وضاحت میں پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''...کیا عجب کہ مغربی دنیا کا حال مشرقی دنیا کا مستقبل بن جائے اس لیے دانشور طبقوں میں عالی سطح پر اس مذاق سے بے زاری بلکہ خوف زدگی کا احساس نمایاں ہورہا ہے۔ سارتر نے اشتہار کی نفسیات کا تجزیہ امریکی تہذیب کے پس منظر میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''امریکہ میں جو قوتیں انسانی شخصیت بدل کر رکھ دیتی ہیں بڑی نرم اور ملائم ہیں اور ان کا عمل آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ آپ ذرا سا سڑک پر نکلیں یا کسی دوکان میں داخل ہوں یا ریڈیو سنیں تو فوراً ہی یہ قوتیں آپ کے اوپر اثر ڈالتی محسوس ہوں گی امریکہ میں آپ سڑک پر اکیلے کبھی نہیں جاسکتے۔ دیواریں تک آپ سے باتیں کرتی ہیں، یعنی اشتہارات یا اس کلچر کا نشہ انسان کے وجود میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ اب وہ خود سے ہم کلام ہونے، اشیا یا مظاہر کو اپنی نظر سے پرکھنے اور آزادانہ فیصلہ کرنے کے آداب سے بھی بے خبر ہے فرد اور انفرادیت کی بے توقیری اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے...''[۳]

زندگی کے اصل مسائل سے اغماض کرتی ہوئی یہ نمائشی صورتِ حال بلاشبہ ہمیں خود اپنی صورتِ حال محسوس ہوتی ہے۔

نظم میں زندگی کے تاجرانہ پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے یہ اشارے ہمیں دفتری زندگی کی ان روزمرّہ منافقتوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سنگین قباحتوں کے بارے میں تفصیلات مہیا کرتے ہیں۔

اس نظم میں محض نمائشی سطح پر موجود ایسی ''لمحاتی رفاقتیں'' بھی ہیں جن میں فریقین ایک دوسرے کے دلوں کا کھوٹ بخوبی جانتے ہیں اور ان میں سے ہر کوئی کسی بھی وقت دھوکہ دینے اور دوسرے سے دھوکہ کھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔

خالص جذبات کی نقالی اور ہمہ دم اپنی پامالی پہ اُتری ہوئی یہ کھوکھلی صحبتیں محض کاروبارِ زر کے فروغ کا سامان ہیں بلکہ بعض اوقات تو اس حد تک تاجرانہ رنگ اختیار کرلیتی ہیں کہ بجائے خود انہیں محض ''کاروبار'' کہا جاسکتا ہے۔

اس حوالے سے نظم کا یہ آخری ٹکڑا دیکھیے:

ہاں بوس نوری بہت خوبصورت ہے
دوسرے شو پہ کل وہ مرے ساتھ تھی
''ترے ساتھ تھی''؟
بہت ہی عجب ہے

''تیسرے شو پہ آ کر مجھے مل گئی تھی''
''نہیں جانتا میں''
اور ہاں سنو آج لالہ مجھے کہہ رہی تھی
نوری کی ساڑھی کو دیکھا ہے تم نے
نئے چاند کی جس پہ تصویر ہے
خشک نتھنوں میں جلتے ہوئے تیل کی بدبوئیں
روشنی شہر پر چھا رہی ہے
اور میں وہیل کے پیٹ میں ہوں

''زوال کا بادل'' ایک ایسی نظم ہے جو اپنے گردوپیش چھائی ہوئی بدہیئتی اور بے سمتی کا نوحہ ہے اسی لیے بادل کی علامت یہاں بارش لے کر آنے والے مہربان پیامبر کے برعکس خوف اور ہیبت میں مبتلا کرنے والے ستمگر کی بن گئی ہے جس کے زیر اثر پورا ماحول اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ یہ بادل ساری فضا کو ایک عجیب ابہام اور ملگجے میں مبتلا کیے ہوئے ہے جس سے نہ وقت کے تعین کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی اس صورتِ حال سے باہر آنے کی کوئی تدبیر نظر آتی ہے۔

J. E. Cirlot کی ڈکشنری A Dictionary of Symbolism میں بادل کی علامت سے متعلق یہ تعریف ملتی ہے:

> There are two principal aspects to cloud symbolism: on the one hand they are related to the symbolism of mist, signifying the intermediate world between the formal and non-formal, and on the other hand they are associated with 'Upper Waters' ___ the realm of the antique Neptune. The Former aspect of the cloud is Symbolic of forms as phenomena and appearance, always in a state of metamorphosis, which obscure immutable quality of higher truth.(4)

اس مبہم اور مہیب فضا میں انسانی زندگی اس کی سب متعلقات اپنے ہونے کے احساس سے عاری ہو جانے کے دکھ میں مبتلا ہیں اس حوالہ سے نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

وہ اک بدہیئت بادل ہے جو اس کمرے میں آتا ہے
تو سب منظر بدلتا ہے
سبھی اشیا لرزتی ہیں

سیاہ بادل سبھی اشیا کی آنکھیں نوچ لیتا ہے
وہ سب بے نور اشیاء رات کے پہلے پہر سے صبح ہونے تک
مرے کمرے کے ہر کونے میں ہر سو روتی پھرتی ہیں
میں ان بے نور اشیا کے
ہزاروں اشک اپنے گرم سینے پر گراتا ہوں
کبھی کھڑکی کے پردوں کو ہٹاتا ہوں
تو سارے شہر کی گلیوں سے ان نوحوں کو سنتا ہوں

ان لائنوں میں امیجری خصوصاً حسِ باصرہ سے متعلق بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بے بصری اور بے نوری کی تمثالیں کمرے میں موجود اشیا تک پہ حاوی ہوگئی ہیں یہ ایک ایسا تکلیف دہ احساس ہے جس نے اشیا کی ''شیئت'' بھی ان سے چھین لی ہے۔ وہ شیئت جو ہمارے نزدیک اپنے ''ہونے'' کا کوئی احساس نہیں رکھتی تو اس صورتِ حال میں خود ہستی اور ہمارے وجود پہ کیا گزری ہے کیا ہم اپنے ہونے کے حق سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ یقیناً نہیں لیکن زوال کا بادل تو چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہونے نہ ہونے اور پھر سب سے بڑھ کر قابلِ توجہ اور قابلِ دید ہونے کا احساس اس نظم کا وہ ___ Paradox ___ جو اسے ایک بنیادی اسم کی مشکل دیتا ہے۔ اہلِ بصیرت ہوں یا اشیائے محض ___ ایک سطح پر سبھی کو اپنی موجودگی کا پتہ دینے کے لیے (بصارت ___ Vision) کا اجالا درکار ہے جسے سیاہ بادل نے چھین لیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نظم میں تفہیم کا ایک معروضی دائرہ بھی اُبھرتا ہے جسے اچانک رونما ہونے والی موسمی تبدیلی کے حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے یعنی بعض اوقات بادل اس قدر ہیبت ناک انداز میں جھک آتا ہے کہ ہم اپنے آس پاس واضح طور پر کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ جغرافیائی اعتبار سے بادل کی یہ قسم ___NIMBO ___ ہے جو پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

> Nimbostratus clouds are the important winter precipitation producus of the middle and high latitudes, they are associated with the large scale forced uplift of stable air. They form a dark, generally textureless cloud layer often partially obscured by precipitation.(5)

نظم ''ہزار پایہ'' ایسے فرد کے خبثِ باطن کو عیاں کرتی ہے جو بلاشرکت غیرے تمام اختیارات پر حاوی ہو جانا چاہتا ہے انسانی زندگی ایک نعش کی طرح اس کے دندانِ آز کا شکار ہے جس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی عہدِ جدید کے لائے ہوئے مسائل میں انسان کی ہوسِ اقتدار اور مطلق العنانی ایک ایسا مسئلہ ہے جو بادی النظر میں کسی عہد قدیم کی غیر متمدّن معاشرت کا مسئلہ محسوس ہوتا ہے لیکن ''جدید'' انسان نے پھر وہی روّیے اپنا لیے جو اسے غیر مہذب کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مقتدر اقوامِ عالم کی حاکمانہ استعماریت ہو یا کسی فرد کا کوئی من مانا روّیہ اس نظم کے

تارو پود میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ''ہزار پایہ'' کا عنوان ہی ایک ایسی علامت کی تشکیل کرتا ہے جو اپنے پنجے ہر سمت گاڑے ہوئے ہے ایک جگہ پر ہوتے ہوئے بھی دور دور تک اپنی متشدد موجودگی کا احساس پیدا کرنا اس دور کے اُس ظالم اور اندر سے خوف زدہ انسان کی تصویر اُبھارتا ہے جو محض ظلم و بربریت کے ذریعے دوسروں کو ڈرا کر خود طاقتور بننا چاہتا ہے۔ نظم کی لائنیں دیکھیے:

ہر ایک شے سے ہزار پائے چمٹ رہے ہیں
زرد صبحوں پہ، سرد راتوں پہ، دن کے چہروں پر
ساری اشیا پہ، سارے شہروں پہ، سارے ملکوں پہ
سارے ملکوں کی چھاتیوں سے لہو کو پیتے ہزار پائے
ہزار پائے جو سارے شہروں کے زرد جسموں کو نوچتے ہیں

اور اب دوسرے مزاج کی حامل وہ نظمیں جن میں اپنے گرد و پیش پھیلی بدصورتیوں کے باوجود شاعر رومانوی سطح پر زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے ان نظموں مین تمام تر جبر کے باوجود زندہ رہ جانا صرف غنیمت ہی نہیں لگتا بلکہ ظلم و تشدد کے خلاف ایک درویشانہ مزاحمت بن جاتا ہے جسے یقیناً شاعر کی متخیّلہ نے اس صورتِ حال سے کشید کیا ہے۔

اس سلسلے کی چند اہم نظموں میں ''اگر موسم بدل جائے''، ''آنکھ کا جادو''، ''انکار کی سرحد پر''، ''پھول کھلے ہیں چیری کے'' اور ''نیلے پانی کشتیاں'' خصوصی توجہ کی حامل ہیں۔

''اگر موسم بدل جائے'' ایک ایسی نظم ہے جس میں زندگی کی تمام تر مجہولیت کے باوجود امید افزائی کا روّیہ سامنے آتا ہے۔ آنے والے اچھے دنوں کی آس میں لمحۂ موجود کی تلخی کسی قدر گھل کر گوارا ہونے لگتی ہے۔

روشن مستقبل کی علامت ''ہمارے گھر نیا مہمان آیا ہے'' کے مصرعے کے باعث زندگی میں طویل انتظار کے بعد خوشی کی ایک تجسیم دکھائی دیتی ہے۔ طفلِ نوزائیدہ دہشت اور خوف کے زیرِ اثر ساکت زندگی کو پھر سے تموّج آشنا کرتی ہے اور ہر سو اس کے ہونے کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

آگے چل کر جزا و سزا کے روایتی تصورات کے برعکس ایک غیر معمولی تیقّن احساسِ جرم کے حامل اور سزا کے منتظر وجود کو اعتبارِ جزا بخشتا ہے۔

یہی یقین کی پختگی مجبور کرتی ہے کہ تمام تر مصائب کے باوجود زندگی کا اعتبار کیا جائے ــــ شاعر کا اس بات پر ایمان ہے کہ زندہ رہنے کی کوششیں اکارت نہیں جائیں گی یہاں تک کہ فرشتے بھی ہمارے شدائد و آلام سہنے کے بعد ہمیں حیرت سے دم بخود ہو کر دیکھیں گے۔ شاعر کی متخیلہ ہمارے الوہی اعتقادات میں خدا کے غفور، رحیم ہونے کا مہربان ہالہ ایک حصار کی صورت میں اپنے گرد دیکھتی ہے اور اُس خالقِ ازل کی پناہ میں آ جانے کا جاں بخش احساس طمانیت بخشتا ہے۔

نظم ''آنکھ کا جادو'' محبوب کے احساسِ قرب کو زندگی کے سارے موسموں میں ایک ڈھال کے طور پر پیش

کرتی ہے اور یہ احساس محض ایک بازآفرینی کا پیدا کردہ نہیں بلکہ شاعر حسّیاتی سطح پر اس سے مسلسل ''کام'' لیتا ہے اور یہی روّیہ صبر وشکیب کو رومانوی فضا کے سحر سے ہم آمیز کر دیتا ہے یعنی کیفیتِ ہجر صرف بیزاری و آہ زاری نہیں ایک دل گذار سرشاری میں ڈھلنے لگتی ہے۔

نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

آنکھ میں اس کی آنکھ کا جادو جاگتا ہے
شام ڈھلے جب زرد دریچوں، سرخ مکانوں اور پیلے کھیتوں پر
نیند کے بادل چھا جاتے ہیں
رات کی کالی بانہوں میں، پھر بتی خوشیوں کی دہلیز پر
سر رکھ کے میں سو جاتا ہوں
اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ اور اس کے گیسو
آنکھ میں جاگتے رہتے ہیں
میں ہر لمحہ اس کے پھول سے گیسو، چاند ستارہ سا چہرہ دیکھتا رہتا ہوں
خاموشی سے اس کی آنکھ سے باتیں کرتا جاتا ہوں

نظم ''انکار کی سرحد پر'' میں شاعر جراتِ انکار کے بعد ملنے والے آگہی اور سرخوشی کو بیان کرتا ہے یہی وہ انکار ہے جس نے تائید کو توجیہہ کی طرف مائل کر دیا ہے۔ بڑے بڑے بتوں کے انکار کے بعد ملنے والا اثبات ہی اصل اثبات ہے جو ہماری اپنی ذات کے بت کو بھی نہیں مانتا اپنی کم دانی وکم مائیگی کی طرف کوئی معذرت خواہانہ روّیہ اپنائے بغیر ہی انکار کی سرحد پر پہنچا جا سکتا ہے ورنہ تو ہم اثباتِ محض کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

پرانی کتھائیں مجھے کھینچتی ہیں
زمین کا زوال آج زنجیر پا بن رہا ہے
خس و خاک کے سارے رشتے
میں نے ہر شے کو اب تج دیا ہے
کوئی معذرت بھی نہیں
کہ معذرت کے سبھی جھوٹے لفظوں کو
اپنی لغت سے نکال آیا ہوں
میں انکار کے آسمانوں پہ پھرتا ہوا
میں انکار کا ورد کرتا ہوا
میں زمینوں اور آسمانوں پہ
انکار کی سرخ مہریں لگاتا ہوا

اور دمام دم کی اک تھاپ پہ
میں نے ساتوں زمینوں کے ساتوں طبق آج روشن کیے ہیں

اقرار کی منزل پہ پہنچنے سے پہلے انکار کی ساری سرحدیں عبور کرنا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ ہمیں ان لائنوں سے بخوبی ہوتا ہے انکار اور تشکیک کی زد میں آئے ہوئے ارض و سما کی تفہیم صرف ''دمام دم اک تھاپ'' پر ہوگی جب ساری سچائیاں اور سب حقیقتیں اُس حقیقتِ ازل کے سامنے ہیچ ہو جائیں گی یہ نظم فلسفیانہ اور سائنسی شعور سے گزر کر سلوک و جذب کی حد تک جانے کی تمنّا کرتی ہے یہی وہ مقام ہے جو انسان صرف اور صرف باطنی تفہیم سے حاصل کرتا ہے اور پہلے سے بیان کردہ کلیے اور قاعدے اس کی راہ میں حائل نہیں رہتے۔

''نیلے پانی کشتیاں'' مدہوش امیجری میں سفر کرتی ہوئی ایک ایسی نظم ہے جو زندگی کے تموّج اور تحرک کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے۔ آسمان پہ صبح کا پرندہ، دوپہر کی دھوپ، مہرباں ہونٹوں کے سائے، خواب جیسی ساعتیں، جسموں کے کھلتے کنول، جنگلوں میں نیلے خیمے اور شب کی پچھلی خلوتوں میں دھیمے دھیمے سے چراغ ہمہ دم آگے بڑھتی ہوئی زندگی کو ایک نیم خوابیدہ نگاہ سے دیکھنے کا عمل ہے مجموعی طور پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ نظمیں ____ موضوعاتی اور فنی اعتبار سے نہ صرف اپنے تخلیقی دور کی نمایاں نظمیں ہیں بلکہ معاصر نظمیہ شاعری میں بھی اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں۔

حواشی:

۱- ہادی حسین (مترجم)، انسانی گفتگو میں شاعری کی آواز، مشمولہ، **مغربی شعریات**، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ص۲۲۸، ۲۰۰۵ء۔

۲- شمیم حنفی، **جدیدیت اور نئی شاعری**، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص۳۸۵، ۲۰۰۸ء۔

۳- ایضاً ، ص۱۹۷، ۲۰۰۸ء۔

۴- A Dictionary of Symbols by J. E. Cirlst: ***Routledge & Kegan Paul***. (London and Henley), Page 50, 1952.

۵- Ralph C. Scott: ***Physical Geography***, West Publishing Company, USA, Page 105 1989.